



Article

The role of poets in the reconstruction of modern Urdu ghazal: selection and analysis

جدید اردو غزل کی تشکیل نو میں شاعرات کا حصہ: انتخاب و تجزیہ

Mohsin Khalid Mohsin^{*1}, Dr. Allah Yar Saqib²

¹ Lecturer, Urdu Department, Govt. Shah Hussain Associate College Lahore

² Assistant Professor, Urdu Department, Hizb-Ur-Rehman Islamic Science College Kamalia TT Singh

*Correspondence: mohsinkhalid53@gmail.com

¹ محسن خالد محسن، ڈاکٹر اللہ یار ساقب²

¹ لیکچرار، شعبہ اردو، گورنمنٹ شاہ حسین ایسوسی ایٹ کالج، لاہور، ² اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، حزب الرحمان اسلامک سائنس کالج، کمالیہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ

eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813
Received: 02-09-2023
Accepted: 20-11-2023
Online: 20-12-2023



Copyright: © 2023
by the authors. This is
an open-access article
distributed under the
terms and conditions
of the Creative
Common Attribution
(CC BY) license

Abstract: In the evolution of Urdu ghazals, where poets have contributed a lot, women poets have also played an important role in advancing its evolution. Instead of traditional themes, women poets have tried hard to present the specific social, political, economic, and moral situation of their era through ghazals and have given the impression through their poetic sensibility that women are more sensitive, conscious, and intelligent than men. Has understanding and a deep understanding of the whole narrative of social change. In this paper, poets from Parveen Shakir to Samina Gul have been critically evaluated, and it has been made to prove that female poets have enriched the genre of ghazal more than male poets and played a key role in its evolution.

Keywords: Urdu Ghazal, classic trend, poetic style, literary terms, social change, Urdu poets, feminine consciousness, modernity

اُردو غزل کو بہ حیثیتِ صنف یہ افتخار حاصل ہے کہ اس کی زلفیں سنوارنے کے لیے ایک زمانہ اس کی طلب میں مارا مارا پھرتا ہے۔ غزل کی صنف کو دیگر اصناف کے مقابلے میں کئی اعتبار سے فضیلت اور فوقیت حاصل ہے۔ اُردو غزل نے قریباً ہزار برس کا سفر طے کر لیا ہے۔ اس ہزار سالہ سفر میں اس نے کئی چہرے بدلے اور ہر چہرے کا ایک جداگانہ رنگ و آہنگ اور انداز و طور تھا جس کی تعریف و تحسین میں شعرا نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ قلی قطب شاہ سے لے کر ولی دکنی سے مرزا خان داغ تک اُردو غزل کا سفر برابر جاری رہا۔ اُردو غزل کا یہ سفر مرزا خان داغ کے بعد سے ہنوز تک جاری ہے۔

اُردو غزل میں طبع آزمائی کرنے والے شعرا کے ساتھ شاعرات کا کام بھی لائق تحسین ہے۔ ماہ لقا چند اسے شروع ہونے والی نسائی غزلیہ روایت پروین شاکر تک پہنچ کر بامِ عروج کو چھو لیتی ہے۔ پروین شاکر سے پیشتر بھی سیکڑوں شاعرات کا تذکرہ میں ذکر ملتا ہے جنہوں نے اُردو غزل کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس میں اپنے فنی اظہار کی انفرادیت کے توسل سے بلند مقام پر متمکن ہوئیں۔ پروین شاکر نے اُردو غزل کو اور پختل نسائی جذبے سے متعارف کروایا جس سے اُردو غزل میں نسائیت کے جملہ جذبات کا خلا ہمیشہ کے لیے پُر ہو گیا۔

یہ مقالہ جدید اُردو غزل کی تشکیل نو میں شعرا کے برعکس شاعرات کے کام، کلام اور معیارِ کلام کے ناقدانہ تجزیے پر مشتمل ہے۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ پروین شاکر سے شمیمہ گل تک شاعرات کے کلام کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے گا جس سے مقصود یہ ہے کہ شاعرات کے ہاں کن موضوعات کی یکسانی ملتی ہے اور انفرادیت کا شاعرانہ اظہار کہاں پایا جاتا ہے۔ نیز شاعرات کے ہاں موضوعات کا تنوع کیا ہے اور وہ کس انداز سے سماج اور سماج سے متصل جملہ صورت حال کو دیکھتی ہیں اور اس پر اپنی رائے کا شاعرانہ اظہار کس طور سے کرتی ہیں۔

اس مقالہ میں پاکستان اور ہندوستان کی شاعرات کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں دُنیا بھر میں جہاں جہاں اُردو زبان بولی جاتی ہے اُن ممالک میں رہائش پذیر شاعرات کو بھی مقالہ کا حصہ بنایا گیا ہے۔ یہ امر اس لیے ملحوظ رکھا گیا ہے تاکہ جدید اُردو غزل کے فروغ اور اس کی لسانی تشکیلات میں ان شاعرات کا مجموعی حصہ کو یکجا کر کے دیکھا جائے جس سے غزل کے ارتقا کی صورت حال کو متعین کرنا مقصود ہے۔

اُردو غزل کے ارتقا میں جہاں مرد شعرا نے بھرپور حصہ ڈالا وہاں شاعرات بھی پیچھے نہیں رہیں۔ ماہ لقا سے لے کر پروین شاکر تک اور پروین سے لے کر فریحہ نقوی تک خواتین شاعرات نے صنفِ غزل کو عزت دی اور جذبات و احساسات کے

جملہ اظہار کے لیے اس صنف کو اختیار کیا۔ ذیل میں اختصار سے خواتین شاعرات کی کاوشات کو اردو غزل کے ارتقا کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اردو غزل میں نسائی آواز کو متعارف کروانے والی ممتاز شاعرہ پروین شاکر کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ پروین شاکر نے اردو غزل میں ریختی کے بعد پہلی دفعہ نسائی جذبات کو پیش کیا۔ اردو غزل میں خواتین کی دہنگ انٹری پروین شاکر سے ہوئی جس نے اردو غزل کو وہ کچھ عطا کیا جو صدیوں سے غزل کے حصے میں نہ آیا تھا۔

پروین کی غزل کا رنگ نسوانی جذبات و احساسات کی بھرپور ترجمانی سے مامور ہے۔ ڈاکٹر خالد علوی نے لکھا: ”غزل میں نسائی لب و لہجہ کی ابتدا کا سہرا پروین شاکر کے سر بندھتا ہے۔ پروین نے ”خوشبو“ کے ذریعے اردو غزل کو نسائی جذبات سے آشنا کیا۔“^(۲) پروین شاکر نے غزل میں عورتوں کے روزمرہ استعمال کی اشیا کا ذکر پہلی بار کیا ہے جس سے اردو غزل کے نسائی امکان کو وسعت ملی ہے۔

”اب تو ہجر کے دکھ میں ساری عمر جلنا ہے / پہلے کیا پناہیں تھیں، مہرباں چتاؤں میں“

”کچھ اتنی تیز ہے سُرخی کہ دل دھڑکتا ہے / کچھ اور رنگ پس رنگ ہے گلابوں میں“

پروین شاکر کی ہم عصر فہمیدہ ریاض نے اردو نظم کو زیادہ برتا۔ آزاد نظم میں انھوں نے ممنوعہ موضوعات پر کھل کر لکھا اور تنقید و تذلیل کی زد میں رہنے کے باوجود اپنے فکری تلازموں اور منفرد سوچ کو سامنے میں جُتی رہیں۔ انھوں نے غزل میں بھی طبع آزمائی کی۔ فہمیدہ ریاض کی باغیانہ آواز اتنی توانا اور مضبوط تھی جس کے آگے کسی جابر کو دم مارنے کی جرات نہ ہو سکی۔ فہمیدہ ریاض نے جدید اردو شعری روایت کو اپنی مخصوص نکتہ رس فکر سے اُجال کر ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے کہ قاری ان کے تفکر کی اُٹھان سے حیران رہ جاتا ہے۔

”وہ واسطے کی طرح درمیاں میں کیوں آئے / خدا کے ساتھ مرا جسم کیوں نہ ہو تنہا“

”جو میرے لب پہ ہے شاید وہی صداقت ہے / جو میرے دل میں ہے اس حرفِ رائیگاں پہ نہ جا“

زہرہ نگاہ کا شمار عہدِ حاضر کی معمر شاعرات میں ہوتا ہے جنھوں نے آزاد نظم کو اپنے شعری افکار سے وقار بخشا۔ انھوں نے ستر کی دہائی میں لکھنا شروع کیا اور ہنوز تخلیقی سفر جاری ہے۔ ان کی آواز جاندار اور ناقابلِ فراموش ہے۔ زہرہ نے زبان کی صفائی، بے ساختگی اور روانی کا خاص خیال رکھا ہے۔ ان کی نظموں کا کینوس بہت ترشا اور مرصع کیا ہوا ہے۔ غزل بہت کم کہی لیکن خوب کہی۔ زہرہ نگاہ مشتاق احمد یوسفی کی طرح آہستہ آہستہ ہو لے واقعات کو اپنے دامن میں اُجالتے رہتے ہیں۔ ایک مدت بعد

جب وہ واقعہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے پھر اسے موزوں کرتی ہیں اور شاعرانہ اُچّ کی مدبرانہ فکر سے قاری کے ذہن پر تادیر تاثر چھوڑتی ہیں۔

”شہرت کے گہرے دریا میں ڈوبے تو پھر ابھرے نہیں / جن لوگوں کو اپنا سمجھا جن لوگوں سے محبت کی“

”ستم تو یہ ہے کہ ہر سیل بے لحاظ کے بعد / کوئی گہر بھی نصیبوں میں ساحلوں کے نہیں“

پروین فنا سید کا شمار بھی جدید ترین غزل گو شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے نسا ئی لب و لہجے کو ایک توانا آواز دی اور رد عمل کی تمام قوتوں کو اپنے شعوری ادراک سے پس پشت ڈال کر تخلیقی سفر جاری رکھا۔ پروین کے ہاں عورت کی زندگی کا زائچہ خانگی معاملات سے باہر نکل کر آفاق تک پھیلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ گلہ و شکوہ اور رنج و محن کے موضوعات میں بھی انسانی معراج کے تنزل کو غیر محسوس انداز میں بیان کرنے کا سلیقہ رکھتی ہیں۔ ان کے ہاں شعری لفظیات کا چناؤ بطور خاص اہمیت رکھتا ہے۔ زندگی کے جملہ مسائل کو انہوں نے نسا ئی حساسیت سے مملو کر کے دیکھا ہے۔ نہایت آسانی سے مصرعے ڈھال کی مہارت نے ان کی غزل کو انفرادیت بخشی ہے۔

”زندگی بھر کے اندھیروں کے عوض / ایک پل آنکھ میں سورج اُترا“

”شہ رگ سے قریب تر ہے لیکن / یاں اب بھی وہی حجاب شاید“

شاہدہ حسن نے پروین شاکر کے ساتھ تخلیقی سفر شروع کیا جو ہنوز جاری ہے۔ شاہدہ کے ہاں نسا ئیت کی زد میں آنے والے نسوانی جذبوں کا استحصال مرکزی موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاہدہ نے نظم و غزل میں عورت کو گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر مرد کے شانہ بشانہ متوازی چلنے کی راہ بھائی ہے۔ سمجھوتے اور مظلوم رسیدہ عورتوں کے مخصوص طبقے کا رنگ بھی ان کی غزل کا فراواں عنصر ہے۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناٹا لکھتے ہیں: ”شاہدہ نے غزل کے روایتی اور عمومی لفظیات کو گہرائی کے ساتھ معنوی دُنیا عطا کی ہے جس سے غزل کا سراپا نئی لیاقت کا نمونہ بن گیا ہے۔“^(۳)

”میں خالی ہاتھ یوں بیٹھی ہوں جیسے / مری اک عمر کا دھن کھو گیا ہے“

”ایک ہی جیسے رات اور دن / گھر پتھر ایسا جاتا ہے“

کشور ناہید کی شاعرانہ اُچّ زہرہ نگاہ کی سی وقعت رکھتی ہے۔ کشور نے نظم و غزل کے علاوہ نثر میں بھی خوب لکھا۔ ان کی زندگی کا انداز بھی باغیانہ تھا اور سوچ کا دھارا بھی شدید رد عمل کا قائل تھا۔ زندگی کے نشیب و فراز سے متصل حوادث کو کشور نے کمال ہوشیاری سے غزل کے مصرعوں میں چھپایا ہے۔ کشور کی زبان کھر دردی اور سخت گیر ہے۔

یہ جذباتی ہوئے بغیر بہت کچھ کہہ جاتی ہیں جو بادی النظر میں کہنا آسان نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر فاطمہ حسن لکھتی ہیں: ”کشور نے روایت سے بغاوت کو انا کا مسئلہ بنالیا تھا، جدت سے انسلاک اور تہذیب سے منافرت نے اس کی شاعری کو تشخص کے عمومی تقاضے سے محروم رکھا لیکن نسائیت کے فروغ کے لیے ان کی خدمات صف اول کی متقاضی ہیں۔“^(۴)

”میرے پیچھے میرا سایہ ہو گا / پیچھے مڑ کر بھی بھلا کیا کرنا“

”کہیں چراغ، کہیں گل، کہیں پہ زلفِ دو تا / تری گلی میں تھیں طرفہ نشانیاں اپنی“

فاطمہ حسن کا شمار اردو کی ممتاز شاعرات میں ہوتا ہے۔ فاطمہ نے غزل عمدہ کہی اور نظم میں بھی خوب دستگاہ رکھتی ہیں۔ فاطمہ نے نسائیت پر بنیادی نوعیت کا کام کیا ہے۔ حقوق نسواں کے حوالے سے فاطمہ کا تحقیقی اور تخلیقی کام اعلیٰ پائے کا ہے۔ غزل میں موضوعات کا انتخاب معیار پر سمجھوتہ نہیں کرتا۔ شعر عمدہ تراشتی ہیں۔ شعری حسیت سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ فاطمہ کے ہاں مردانہ لب و لہجے کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ان کی غزل کالب و لہجہ اپنے اندر بغاوت کے ساتھ سمجھوتے اور لجاجت کی فضا لیے ہوئے ہے۔ کہیں کہیں بہک جاتی ہیں اور کہیں سامنے ڈٹ جاتی ہیں۔ ان کی غزل میں ملے جلے جذبات کی ایک رو ہے جو بہتے دریا کی طرح دیر تلک قاری کے تفکر کو چیلنج کرتی رہتی ہے۔ شعر سہل کہتی ہیں لیکن داخلی احساس بہت گہرا ہوتا ہے۔

”بہت گہری ہے اُس کی خامشی بھی / میں اپنے قد کو چھوٹا پارہی ہوں“

”اب گھل گیا لہو میں تو انجام کچھ بھی ہو / کیا مل سکے گا زہر کی تاثیر دیکھ کر“

مونا شہاب کی غزل کا تانا بانا ہجرت سے متصل مسائل اور روایتی عورت کی خانگی زندگی سے بُنا ہے۔ مونا نے غزل کو عورت کے سراپا داخلی و خارجی چہرے سے متعارف کروانے کے لیے بطور وسیلہ استعمال کیا ہے۔ مونا کی زبان صاف اور دُکھ گہرا ہے۔ مونا کے ہاں غزل کا رنگ و آہنگ گھٹا ہوا اور ثقیل دکھائی دیتا ہے۔ ان کے ہاں رات کا تصور دن کے اُجالے کو شرمسار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ غزل سسک سسک کر کہتی ہیں جبکہ شاعرانہ اسلوب میں کلاسیکی روایت کے تتبع کا گہرا انخیال شعوری طور پر ان کے مصرعوں میں جھلکتا نظر آتا ہے۔

”گھر میرا کھو گیا ہے مگر یاد ہے مجھے / آنگن میں اس کے ایک شجر سایہ دار ہے“

”مجھے عزیز ہے پرکھوں کی آن بھی تو کیا / جو میں وارثِ اہل زبان بھی تو کیا“

زیب النساء زبیبی کی غزل بھی اپنے عہد کی ترجمان ہے۔ زبیبی نے زندگی کے خفیہ رنگوں کو حوادثِ زمانہ کی سیاہی سے نکھارنے کی کوشش کی ہے۔ زبیبی کے فارسی روایت کا تتبع ملتا ہے۔ معاشرتی کرب و نارسائی کا دکھ بہت گہرا محسوس کیا ہے۔

جذباتی اور ناامیدی کا پر تو صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ زمینی کے ہاں زندگی کے جملہ رنگ ملتے ہیں۔ انھوں نے غزل کے سانچے کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے۔ زمینی کے ہاں نرمل، کوئل اور فرخندہ نسائی کیفیات کی جھلم برستی بارش میں ٹھنڈے جھونکوں کی طرح آآ کے لگتی ہے۔

”بہاریں مسکراتیں ہیں نہ فصل گل ہی آتی ہے / یہ میرے شہر کی سڑکوں پہ تازہ خوں بہانے سے“
حمیرا رحمان خواتین شاعرات میں نمائندہ شاعرہ ہے جس کی غزل میں مقامیت کے ساتھ آفاقی شان پائی جاتی ہے۔ حمیرا زندگی کی رنگینوں اور آلام کو خوبصورتی سے غزل کے پیرائے میں سمویا ہے۔ نسوانی حسیت کا گہرا ادراک حمیرا کے اشعار کو تغزل کا چہرہ عطا کرتا ہے۔ حمیرا نے خود کو اپنے دامن میں مقید کر رکھا ہے۔ یہ باہر کی دنیا سے خوفزدہ ہے۔ اس کے ہاں گھٹن، بے قراری اور بے چینی کی شدید ہیجان انگیز صورت حال ملتی ہے جس سے قاری بعض دفعہ اکتا جاتا ہے اور شاعرہ سے ہمدردی بھی رکھتا ہے۔

”مری خوش نامیوں میں ہے مری رسوائیوں میں ہے / وہ میری ذات کی چھوٹی بڑی سچائیوں میں ہے“
نسیم سید کا شمار کشور ناہید کی قبیل کی شاعرات میں ہوتا ہے۔ نسیم نے غزل کے علاوہ نظم کہی اور عمدہ کہی۔ صالحہ صدیقی لکھتی ہیں: ”نسیم نے مظلوم و محکوم اور بے بس و لاچار عورت کی وکالت کی اور اس کے حوصلے اور ہمت کو سراہا ہے۔“ (۵) نسیم نے خانگی معاملات کی حق تلفی اور پد سری سماج کی اجارہ داری کو غزل کے کینوس پر خوبصورتی سے پوٹریٹ کیا ہے۔ نسیم سید نے غزل کو سچ سچ کر لکھا ہے۔ ان کے موضوعات منتخب اور متعین ہیں۔ یہ غزل کو اظہار کا ایک وسیلہ سمجھتی ہیں۔ ان کے رکھ رکھاؤ کی مشرقی تہذیب کا تصور بھی ملتا ہے۔ نسیم کے ہاں سمجھوتے کی زیست سے بہتر خود کشی کا حوصلہ ہوتا ہے۔ نسیم نے ممنوعہ موضوعات پر بھی لکھا اور خوب لکھا۔

”آداب ضبط عشق نہ رسوا کرے کوئی / اپنی بساط دیکھ کے سودا کرے کوئی“

”دیوارِ انا سے تھیں پر سے اُس کی صدائیں / پتھر ہوئے پر ہم نے پلٹ کر نہیں دیکھا“

رفعیہ شبنم عابدی کے ہاں تانیثی رجحان کا زیادہ غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ رفعیہ نے زوجین کی باہمی مناظرت اور مجاہدات کو خوبصورتی سے نظم اور غزل میں بیان کیا۔ رفعیہ نے زندگی کے نشیب و فراز سے مستعار دکھوں اور آسائشوں کا نام دکر ان سے نبھاہ کرنے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ رفعیہ کے ہاں غزل کی کہنہ روایت کی پیروی دکھائی دیتی ہے۔ رفعیہ کی توجہ زیادہ نظم کی مائل رہتی ہے۔ غزل کبھی کبھار کہتی ہیں۔ مطلعے نکالنے میں انھیں ملکہ حاصل ہے۔

”مرے غرور کا پتھر پگھل کے موم ہوا / کہ اُس کی گرم نگاہوں میں پیار ایسا تھا“

ذکیہ غزل کی شاعری سماجی شعور کی شاعری ہے۔ ذکیہ نے عورت کے وجود کو ملا متی بنانے کی بجائے انسانی توازن کا اعلیٰ معیار قرار دیا ہے۔ ذکیہ زبان پر گرفت رکھتی ہیں۔ ان کی شعری تلازموں سے لبریز غزل سماج کے دوہرے نظام کو خوب واضح کرتی ہے۔ ذکیہ نے خود کو غزل تک محدود کر رکھا ہے۔ ان کے ہاں غزل کے جملہ اسالیب کا تتبع دکھائی دیتا ہے۔ خانگی مسائل اور عورتوں کی نجی زندگی کی بے قراریاں ایک ستم کی صورت ان کے فکری شعور پر گھات لگا کر بیٹھی دکھائی دیتی ہیں اور یہ کمال حوصلہ کے ساتھ ان کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑی ہیں۔ ذکیہ نے غزل کے لہجے سے سپر کا کام لیا ہے۔

”مراد شمن نہیں کوئی یہاں پر / منافق دوستوں میں گھر گئی ہوں“

یاسمین حمید کا تعلق عہدِ حاضر کی قد آور شاعرات میں ہوتا ہے۔ یاسمین نے شاعری میں عورت کے سراپا کو قلمی مصور کیا ہے۔ ان کے ہاں چاند، سورج، ستارے، صحرا، سمندر ایسے تشنہ طلب الفاظ کثرت سے دہرائے گئے ہیں جو شاعرہ کی فکری گہرائی کے خوابیدہ خوابوں کی ناتمام تعبیروں کا پتہ دیتے ہیں۔ خالد علوی لکھتے ہیں: ”یاسمین حمید کی غزلیہ موضوعات میں کافی تنوع موجود ہے ان کی بعض غزلوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ اس پر نظم کے اسلوب کا پرتو ہے۔ یاسمین نے نظم اور غزل میں بہت کم فرق ملحوظ رکھا ہے۔“ (۶)

”مرے احساس کی مجبوریاں ہیں / اُسے پیچھے بھی مڑ کر دیکھنا ہے“

”مر اچہرہ ہے برسوں کی کہانی / بہت کچھ دیکھتی ہوں آنے میں“

شبّٰنم شکیل کی شاعری اُردو ادب میں ایک نیا اضافہ ہے۔ شبّٰنم نے اُردو غزل کی اُٹھان کو زندگی کے ذاتی تجربے سے اوپر اُٹھایا ہے۔ ان کی غزل کا رنگ کرب سے عبارت ہے۔ شبّٰنم نے اضطراب کو حاصل حیات سمجھ لیا ہے اور اس کے طلسم میں شعری سفر کو بے سود نہیں ہونے دیا۔ شبّٰنم نے جس انداز سے غزل کہی۔ یہ انداز بہت کم شاعرات کو نصیب ہوا ہے۔ ان کا کل سرمایہ حیاتِ آداب و لحاظِ احساس کی دین ہے۔ شبّٰنم نے غزل کی آبرو کو عورت کے دوپٹے کی طرح سنبھالا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا نام جدید غزل کی نمائندہ شاعرات میں لیا جاتا ہے۔

”جن لوگوں کی قربت میں بہلتا ہے بہت دل / وہ بھی نہ منافق ہوں گے مجھ کو یہ ڈر بھی“

”یہ میرے بچپن کی سہیلی میرے غموں کی ساتھی ہے / کیوں میری کھڑکی سے لگ کر روتی ہے برسات سنو“

شفیق فاطمہ شعری نے اُردو غزل کو انسانی جذبات سے تلمیحی رنگ میں آشنا کیا۔ فاطمہ کے شعری مجموعوں میں ارتقا کا عمل تسلسل رکھتا ہے۔ انسانی جذبات و احساسات کا نرمل، کومل اور دلآویز بیان ان کے اشعار میں درد کی شدت کے باوجود گداز اور ٹھہراؤ رکھتا ہے۔ شفیق فاطمہ مرکز سے دور رہ کر غزل کہہ رہی ہیں۔ ان کی مصروفیت کے پیش نظر غزل پر ان کی توجہ کم رہتی ہے۔ ان کے شعری مجموعے کی تاخیر سے اشاعت کی بھی یہی وجہ ہے۔ شفیق فاطمہ کے ہاں جدید آہنگ کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔

”وہ ہے اک اچھوتا نقشِ مر مر میں چٹانوں پر / یہ سفید بالوں کا نورِ آسمانی ہے“

”اب انتظار کی گھڑیاں گراں نہیں ہوں گی / وہ میرے فصلِ گزشتہ کے ہم صفر آئے“

عفت زریں کا شمار نمایندہ غزل گو شاعرات میں ہوتا ہے۔ عفت نے شعر کے مختلف اسالیب متعارف کروائے، عفت کے نسائیت مستقل موضوع کی حیثیت سے غزل کا چہرہ بن گیا ہے۔ عفت نے خفیف اشاروں میں ممنوعہ افکار اور انسانی حسیت کو طشت از بام کرنے کی کوشش کی ہے۔ عفت نے جو سپیس آنے والی شاعرات کے لیے بنائی ہے اُسے عہدِ حاضر کی شاعرات نے آگے بڑھ کر لیا ہے۔ اساتذہ کے فن سے استفادہ کا صاف پتہ چلتا ہے۔

”کیسے پہنچے منزلوں تک و حشمتوں کے قافلے / ہم سراپوں سے سفر کی داستاں کہتے ہوئے“

”یہ داستاں ہی سہی دل نشیں اُمیدوں کی / اداسیوں میں رقم ہو تو زندگی بدلے“

مسعودہ حیات کا شعری سفر حساسیت کے درپردہ انسانی نظام کا پرتو ہے۔ مسعودہ نے زندگی کو محبت کی نظر سے دیکھا اور دھوکا کھایا۔ گلہ و شکوہ اور رنج و ماتم کا سنجیدہ اور ٹھہراؤ ہوا اظہار ان کی غزل کا نمایاں وصف ہے۔ مسعودہ نے غزل کو مردانہ اُسلوب میں شعوری طور پر برتا ہے جس میں یہ کامیاب رہی ہیں۔ ان کی غزل کے تشبیہ اور استعارے مستعار معلوم ہوتے ہیں جن میں ان کی ذاتی پسند کا دخل بہت زیادہ ہونے سے غزل کی زمین کھردری اور لہجہ سپاٹ ہو جاتا ہے۔

”پھونک ڈالیں نہ کہیں اپنا نشیمن خود ہی / کوئی صورت ہو کہ ہم برق و شرر کو بھولیں“

”اب تمہاری رنجش بے جا کے وہ تیور کہاں / جن کو ہم دل میں چھپالیں آج وہ نشتر کہاں“

فاطمہ جائسی کا شمار عہدِ حاضر کی نمایندہ غزل گو شاعرات میں ہوتا ہے۔ فاطمہ نے زندگی کی ہمہ گیری اور اطوار کی تنگ دامانی کا نقشہ کھینچا ہے۔ آسودہ حالی کی ناشکر گزاری ان کے ہاں نمایاں ہے۔ فکر و فن سے دلچسپی غزل کے رنگ کو پختہ کیے ہوئے ہے۔ فاطمہ کے ہاں سماجی شعور کی تنزلی کا احساس بہت فراواں ملتا ہے۔ فاطمہ نے غزل کو انسانی حیات کے ایسے کے طور پر پیش کیا ہے۔ فاطمہ کے ہاں شاعرانہ حسیت کا شعور ان کی زندگی کی ہمہ جہت فکر کا غماز ہے۔

- ۱۔ ”یہ کیا ہوا کہ جب آزادیاں ملیں ہم کو / ہے خوف اتنا کہ ڈر ڈر کے سانس لیتے ہیں“
- ۲۔ ”آنکھوں کے لیے اشک تو دل کے لیے الجھن / بھیجی ہے مرے واسطے سوغات کسی نے“
- حمیرا رحمان کا شمار عہد حاضر کی نسائی جذبات سے مملو شاعرات میں ہوتا ہے۔ حمیرا نے بدلیسی ممالک میں بسنے والی عورت کے کرب اور مسائل کو شاعری کا موضوع بنایا۔ مشینی دور کی ہنگامی دوڑ میں بے سرو پا عصمت کے بکتے بازار میں نسائیت سے معمور باکرہ کی پکار کون سنتا ہے۔ یہ کرب حمیرا کے ہاں آفاقی شان لیے قاری کو گنگ کر دیتا ہے۔
- ۳۔ ”دروازوں میں رکھے کنو اب واطلس گل چکے ہیں / نئے پیرانوں کا شوق بڑھتا جا رہا ہے“
- ۴۔ ”اپنے آپ کو جل بھیجنے سے کیسے کوئی محفوظ رکھے / کبھی دکھوں کا انت الا و کبھی اُداسی کا جوالا“
- ریحانہ قمر نے محبت کے موضوع کے فلسفے کو تنقید کی نگاہ سے پرکھا ہے۔ ریحانہ کے محبت کے سیکڑوں روپ اور زاویئے دکھائی دیتے ہیں جن میں منافات اور کھوکھاہٹ کی اجیرن کر دینے والے بدبو کا گدلا سمندر ٹھاٹیں مار رہا ہے۔ ریحانہ نے جرات سے مونولاگ کے ہتھیار سے مغموم اور یاس لڑکی کو سہارا دیا ہے کہ وہ آگے بڑھے اور خوف مت کھائے۔
- ۵۔ ”کچھ نہیں تھی میں، تو مجھ کو کچھ نہیں کہتے تھے لوگ / جب ملی عزت و میری عزت افزائی گئی“
- پروین شیر اُردو غزل کا ایک بڑا نام ہے۔ پروین نے موصوری اور موسیقی کی مخصوص علامتوں اور رمزیات کو شعر کے قالب میں ڈھالا۔ شاعری کی حسی شعریت سے گہری آشنائی تھی۔ نسائی جذبات کی قد آور مبلغ ہیں۔ اشعار طبیعت کی موزونی پر منحصر ہے۔ فکر کی گہرائی سے ادراکِ حیات کا فلسفہ ان کے یہاں پھوٹتا ہے۔ عتیق اللہ نے لکھا: ”پروین شیر زندگی کے متنوع چہروں کو ایک چہرے میں مقید کر دیا۔ فنونِ لطیفہ سے دلچسپی ان کی تخلیقی جودت کو بڑھانے میں کام آئی ہے۔“ (۷)
- ۶۔ ”تری قربت سے سنور جائے وفا کی تقدیر / شبِ فرقت کو درخشنده ستار مل جائے“
- ۷۔ ”تھکن سے چور تمہارے قریب آئی ہوں / کہ اب وجود میرا شکست خوردہ ہے“
- نزہت صدیقی اچھا لکھ رہی ہیں۔ معاشرے کی مصنوعی اور کھوکھلی معاشرت پر گڑتی ہیں۔ عورت کو گھر کی چار دیواری میں محصور رہ کر حق مانگے سے باہر نکل کر عملی جہد کرنے پر اکساتی ہیں۔ شعر میں نشتریت جگر چیرتی ہے۔ نزہت کے ہاں جدید موضوعات کی کمی ہے۔ کلاسیکی روایت کے تتبع میں ان کے ہاں کلاسیکی موضوعات پر طبع آزمائی کا رجحان ملتا ہے۔ ان کے تشبیہ، استعارے اور علامتیں کلاسیکی ہیں۔ جدید رنگ و آہنگ سے بے نیاز ہو کر غزل کہتی ہیں۔ ان کی غزل کا رنگ داخلی ہے جو میر کی یاد دلاتا ہے۔

”آنکھیں کھلیں، گناہ کا احساس ہو گیا / غم سے ترے حیات ملی، رہبری ملی“

”یہی سلسلہ ازل سے یہی سلسلہ ابد تک / کبھی زندگی مصیبت، کبھی زندگی ہے راحت“

گلنار آفریں کے ہاں نسائی حساسیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کے ذاتی تجربے خارج کی دنیا سے مختلف نہیں ہیں۔ گلنار نے محبت کو ایک لائینی جذبہ قرار دیا ہے اور اس کے کالے بادل کی گھٹائیں بھیگنے سے گریز کیا ہے۔ گلنار آفریں کی غزل میں ایک بھرے پُرے گھر کی رونق جلوہ افروز دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے ہاں سماج کے منفی تاثر اور سیاست کی گرم بازاری کا نوحہ ملتا ہے۔

”اپنے آنچل کے تقدس کی قسم کھاتی ہوں / سیکڑوں جلوے نظر کے لیے انجانے ہیں“

”میرے بچو! گھر کا آنگن تم بن کتنا سونا ہے / رات کو پیروں روئی تھی جب دھیان تمہارا آیا تھا“

زاہدہ زیدی نے غزل کی زمین کو اپنے اتھاہ گہرے خیالات سے وسعت دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ان کے ہاں نسائی جذبات کی ترجمانی سنجیدہ انداز میں ملتی ہے۔ جذباتی ہونے کی بجائے انسانی نفسیات کی گہرائیوں کو تجربے کی سپر سے چاک کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ آسمہ صدیقی لکھتی ہیں: ”زاہدہ زیدی نے استعارات کی دنیا میں ایک خاص تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ہے تخلیقی تجربہ کا بیان۔ تخلیقی تجربہ کو کہیں انہوں نے عشقیہ بیان، کہیں تاریک گہرائی، تجسس، تھیر اور تلاطم وغیرہ کے استعاروں سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور زاہدہ زیدی اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب ہیں۔“^(۸)

زاہدہ نے اپنے اندر کی عورت کو تلاش کی شاعری میں کوشش کی ہے۔ یہ سوال اٹھاتی ہیں اور ان کے جواب میں سرگرداں رہتی ہیں۔ زاہدہ کی غزل میں نسائیت کے جملہ موضوعات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

”اب حلقہ گرداب ہی آغوش سکوں ہے / ساحل سے بہت دور ڈبوئے ہیں سفینے“

”جن سے پچھڑے تھے تو تاریک تھی دنیا ساری / ہم انھیں ڈھونڈ کے پھر لائیں ضروری تو نہیں“

اوشا بھدروریہ کے ہاں نسائی جذبے کی ترجمانی مخصوص علامتی انداز میں ملتی ہے۔ اوشا نے عورت کے مسائل کو کم اور اس کی اہمیت کو زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ زبان پر گرفت اور مطالعے کی وسعت سے خیالات میں گہرائی اور تنوع پایا جاتا ہے۔

”ہر یاد مری روح میں خوشبو سی کھلی ہے / تو میرا وہ لمحہ ہے جو گزرا نہیں لگتا“

”گھر کے دروازے پہ دستک لکھ گئی پاگل ہوا / دل یہی کہتا رہا تو لوٹ آئے گا ضرور“

ریحانہ عاطف خیر آبادی نے معشوق، عاشق اور عشق کی تثلیث کو شاعرانہ توازن بخشا ہے۔ ریحانہ کے ہاں ارضی فلسفے کی استعاراتی تفہیم ملتی ہے۔ ریحانہ نے سماجی اقدار کا ذکر کیا ہے۔ ریحانہ کی غزل میں روزمرہ مسائل کے ساتھ فکر کے ارتقا کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ریحانہ نے عورت کی نفسیات کے مختلف شیڈ کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ ریحانہ کے پدر سری نظام کے خلاف بغاوت کا عنصر بھی دکھائی دیتا ہے۔ ریحانہ اپنا حق مانگتی ہے، خود کو کمزور اور ناتواں نہیں سمجھتی۔ ان کی غزل کا لہجہ نسائی ہونے کے باوجود مردانہ آہنگ کا مظہر ہے جس سے ان کی غزل میں سطحیت کی بجائے داخلیت در آئی ہے جو فنی نکتہ نظر سے ایک اہم اضافہ ہے۔

”کس کو بچپانوں گے جا کر کیا گرو گے شہر میں / پاؤ گے ہر ایک کے چہرے کو اب بدلا ہوا“

”میں نے مانا کہ وہ سمندر ہے مگر کس کام کا / ایک قطرہ بھی کسی کو چلا سکتا نہیں“

ملکہ نسیم نے غزل کو تنہائی، افسردگی، بے چینی اور نامعلوم خوف سے متعارف کروایا ہے۔ ملکہ کی زندگی کے شب و روز نا قابل یقین حوادث میں گزرے جس کا اثر ان کی فکر پر براہ راست پڑا۔ ملکہ نسیم نے انسانی شخصیت میں کارفرما منفی تاثر کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ علامتی انداز کو اختیار کرنے پر یقین رکھتی ہیں۔ ان کے ہاں سماجی گھٹن کے ساتھ یقین ذات کی کم مائیگی پائی جاتی ہے۔ یہ کچھ ڈھونڈ رہی ہیں جو انھیں مل نہیں رہا۔ ان کی غزل کو مرکزی موضوع تلاش ہے جو سفر سے محروم ہے۔

”کسی کے ساتھ ذرا دور چل کے دیکھو تو / کسی کے درد کو پلکوں سے چُن کے دیکھو تو“

”دلوں کو جھکنے جھکانے کا فن اگر آجائے / جہاں سے تفرقہ بازی کا ہر چلن مٹ جائے“

ساجدہ خاتون تشنہ کے ہاں شاعری محض شغل بازی کا ذریعہ نہیں بلکہ محبت سے آگے حصول کی چیز ہے۔ ساجدہ نے معاشرتی تنافر کو سماجی تنزل سے مدغم کر کے دیکھا ہے۔ چہروں کے پیچھے چھپی مفاد پرستی اور متحوس نگاہوں کی زنائی خواہشیں ان کی شاعری میں حساس دل کو گھائل کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ساجدہ کے ہاں ہم عصر شاعرات کے شاعرانہ اسلوب کا تتبع ملتا ہے۔ ساجدہ نے زندگی کے پروردہ اصولوں سے انحراف کیا ہے۔ یہ آزاد فضا میں سانس لینا چاہتی ہے اور قید و بند کی صعوبتوں سے خود کو رہائی دلوانا چاہتی ہیں۔

”نئی اک دُنیا بنانے کو جی چاہتا ہے / جہاں کو گلے سے لگانے کو جی چاہتا ہے“

”اپنی حاجت کے لیے بھی لب ہلا سکتے نہیں / چارہ گر کوئی نہیں، درد کا درماں نہیں“

عذرا پروین نے اپنا منفرد لہجہ متعین کیا ہے۔ ان کی نظم کا کینوس کھلے آسمان کی طرح وسیع ہے۔ غزل میں متنوع رنگوں کی آمیزش ہے۔ زمانے کو نئے انداز سے دیکھتی ہیں اور اپنی رائے سے قاری کو محاسبے تک لے آتی ہیں۔ عذرا پروین نے مردانہ سماج کے جملہ اصول و ضوابط سے سمجھوتہ کر رکھا ہے۔ ان کے ہاں عورت مرد کے سامنے بچھی اور تابع فرماں ہی اچھی لگتی ہے۔ عذرا نے مشرقی شعریات میں عورت کے اصل مقام کو ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ عذرا کی غزل کا رنگ مولانا حالی والا ہے۔ ڈاکٹر وصیہ عرفانہ لکھتی ہیں: ”عذرا مرد کی ازلی صفات اور عورت کی نسائی جبلت سے بخوبی واقف ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ عورت کی نسوانی کمزوریاں ہی مردانہ حربوں کو توانائی عطا کرتی ہیں۔“ (۹)

”میں پھر تمہارے قدموں سے چل پڑی ہوں شاید / تم جاگتے ہو مجھ میں میں سورہی ہوں شاید“

”میں جس میں بھیگ کر ہو جاؤں بادل / گھٹا لپی مرے چہرے چور برسا“

فرح زہرا گیلانی نے مغربی ادب سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے ہاں مغربی اساطیر کی بازگشت سنائی دیت ہے۔ فرح نے عورتوں کے وجود کو مردوں کی کمین نگاہوں سے مستور رکھنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ عورت کے جذبات کی سطحی ترجمانی فرح کو بُری لگتی ہے۔ یہ مرد کی طرح سوچنے کو ترجیح دیتی ہے۔ فرح نے ایک پڑھے لکھے سماج میں انسانی فکر کی آزادی کی بات کی ہے۔ فرح کے ہاں مردوں کی سی وضع کو آئیڈلائز کرنے کی سوچ پر طعن دکھائی دیتی ہے۔ یہ اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی قائل ہیں۔

”بے مہریوں کی دھوپ نے جھلسا کے رکھ دیا / میں ریزہ ریزہ ہو کے جہاں میں بکھر گئی“

”مجھ کو بخ بستہ ہواؤں نے بتایا یہ بھی / وہ پرندہ ہے کہیں دور چلا جائے گا“

حمیدہ معین رضوی کے ہاں شدید رد عمل کی صاف آواز سنائی دیتی ہے۔ حمیدہ نے تیزی سے بدلتے سماج کی غیر معمولی رفتار میں عورتوں کو قدم بڑھانے کا مشورہ دیا ہے۔ وقت کی اس رفتار کے ساتھ تصورات کی گراؤٹ کو حمیدہ نے خوبصورت انداز میں شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔ حمیدہ معین رضوی نے عورت کی خواہشات کو ایک رد عمل کے طور پر پیش کیا ہے۔ حمیدہ کے ہاں عورت کے کئی رنگ اور روپ ہیں جن سے عورت خود بھی شناسا نہیں ہے۔ حمیدہ نے عورت کے وجود کو تار تار کر کے اس کی تحلیل کر کے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

”لڑکیاں جو کتاب لکھی رہی ہیں / زندگی کے عذاب لکھ رہی ہیں“

ساجدہ زیدی ایک معمر کہنہ مشق شاعرہ ہیں۔ ان کی غزل کا خمیر مشرقی اخلاقات کی بے توقیری سے اٹھا ہے۔ انھوں نے عصر حاضر کے انسان کی بے بسی، تنہائی، کسمپرسی اور لایعنیت کے فلسفہ کو شعروں میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے اُتار چڑھاؤ اور

خوابوں کی تشنہ تعبیروں کی کسک ساجدہ کے ہاں شدت سے آگہی سے متصف ذہن کو متاثر کرتی ہے۔ صائمہ ثمرین لکھتی ہیں: ”ساجدہ زیدی اپنے وجود اور خودی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ وہ اپنی ہستی اور نیستی میں فرق جاننا چاہتی ہیں۔ وہ اپنے اطراف کے مسائل کو بغور سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ اپنے ذہن کی افتادگی کے سبب کبھی تلاش خودی میں محو ہوتی ہیں تو کہیں راز کن فکاں کے نہاں خانوں کا پتہ لگانے میں مستغرق۔ فطرت کے مناظر سے استعارے اخذ کرتی ہیں۔“^(۱۰)

”ترے خیال سے آگے مری نظر پہنچے / ہمارے عشق کا ہر اک زباں پہ چرچا ہو“

”دھنک کے رنگوں کی پرواز مجھ میں جب ہوتی / میں تتلی کاڑھنے لگتی تگی پیر ہن کے لیے“

تسنیم عابدی کی شاعرانہ اُٹھان ان کے ذاتی تجربات کی مرہون منت ہے۔ تسنیم نے عورت کے جذبات کی جملہ عکاسی کی ہے۔ بطور عورت انھوں نے پدر سری نظام میں اپنے حق کے حصول کے لیے شعر کو ہتھیار بنایا ہے۔ ان کا تخلیقی سفر جاری ہے۔ تسنیم کے ہاں نظمیں آہنگ کا رجحان ملتا ہے۔ سہل اور رواں مصرعوں کو تراشنے کا فن جانتی ہیں۔ ان کے ہاں بیرون ممالک کی چکاچوند میں آزاد عورت کے مسائل کا بیان ملتا ہے۔ فیشن ایل خواتین کی انار ملٹی کو انھوں نے غزل کا موضوع بنایا ہے۔

”سو نہیں گیا، مجھے سمجھا نہیں گیا / تاریخ میں مجھے لکھا نہیں گیا“

آشا پر بھات نے رسالوں میں لکھا اور انھیں خوب سراہا گیا۔ بہت کم گو ہیں لیکن عمدہ سخن شناس ہیں۔ ان کی غزل کا رنگ داخلی ہے۔ زبان پر گرفت کی وجہ سے تخلیقی پیکر تراشنے میں خصوصی ملکہ رکھتی ہیں۔ آشا پر بھات کے ہاں نسائی نرگسیت کا رجحان ملتا ہے۔ آشا کا نکتہ نظر ہے کہ عورت کو بھی اپنی زندگی کے جیون ساتھی کا انتخاب کرنے کا موقع اور اختیار ملنا چاہیے۔ عورت بھی مرد کی طرح ایک متنفس ہے جس کی اپنی ایک دنیا ہے، اس کو اپنے طریقے سے جینے اور زیست کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔

”یہ بات الگ ہے کہ توجہ نہ دی ہم نے / دل کھینچنے والے تو نظارے بھی بہت تھے“

صوفیہ انجم تاج بنیادی طور پر ایک شاعرہ ہیں۔ ان کی مصورانہ قوت رنگوں سے کینوس پوٹریٹ نہیں کرتی بلکہ اشعار میں ڈھل کر انھیں موقع بنانے کے کام بھی آتی ہے۔ صوفیہ نے اپنے گرد و نواح کے ماحول اور معاشرت کے جزئیات کے ساتھ غزل کے سانچے میں پرویا ہے۔ صوفیہ نے غزل کے سانچے کو کلاسیکی روایت سے مزین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے شاعرانہ اُجھک کا منجھا ہوا فنی شعور ملتا ہے۔ صوفیہ نے طویل بحر میں اپنے جذبات کے اظہار کو ترجیح دی ہے۔ صوفیہ سوال اُٹھاتی ہیں اور چونکا دیتی ہیں۔

”میں کب سے ماضی کے تانے بانے ادھیڑتی اور بُن رہی ہوں / بتائے کوئی میں جاگتی ہوں کہ کرچیں خوابوں کی چُن رہی ہوں

”ہوں نگاہ میں وہی رونقیں، وہی رسم و راہ میں لذتیں / کوئی ایسی تازہ ہوا چلے، مرا نقشِ ماضی ابھار دے“

اندر اشبنم کے ہاں نسائی شعور ذاتی تجربے سے مہمیز ہوا ہے۔ اندر نے غزل کو اپنے اندر کی خلفشاری کے انخلا کے لیے استعمال کیا۔ ان کے ہاں بے کسی اور لاچاری کی مفلسانہ مبالغہ پسندی نظر آتی ہے۔ عورت کی محدود کائنات کو اپنے قلم سے وسیع کرنے کی کوشش میں مگن ہیں۔ اندر نے غزل کے سانچے کو کلاسیکی روایت سے متصل کر کے جدت سے ہم آہنگ کیا ہے۔ اندر کے تلمیح، استعارہ اور تشبیہ کی واردات ملتی ہے۔ اندر کو زبان پر گرفت میسر ہے جس سے یہ پورا فائدہ اٹھاتی ہیں۔

”لگتا ہے من پہنچ گیا وہاں / پریم ندیاں جہاں سے جاری ہیں“

”سچائی جیون کی چاہے کچھ بھی ہو / ہم کو تو سب افسانہ سا لگتا ہے“

شاہدہ نسیم نے نسائی تصور کو باضابطہ تحریک کی شکل دی ہے۔ مرد سماج میں عورت کو عزت دے جینے اور معیار پر سمجھوتہ نہ کرنے کا شعور شاہدہ کی غزل کا مرکزی موضوع ہے۔ عمدہ شعر تراشتی ہیں۔ شاہدہ نے غزل میں نسائی تیور کو متعارف کروایا ہے جو ایک نیا رجحان ہے۔ شاہدہ کے ہاں عورت کی وقعت اس کے جذبے سے نہیں بلکہ اس کے جذبات کے شعوری ادراک سے نمود پاتی ہے۔ شاہدہ نے پدر سری سماج میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ وفا کی دیوی کو پاؤں کی جوتی سمجھنے والے آج اسی پاؤں کی دھول میں کھو گئے ہیں۔ وقت بدل چکا ہے اور سماج کے بیانیہ بھی تبدیل ہو چکا ہے۔ مرد کو چاہیے کہ وہ اپنا نسائی تناظر کے حوالے سے اپنا بیانیہ تبدیل کرے۔

”تم کیا گئے کہ لے گئے آنکھوں سے سارے خواب / ورنہ ہمارے بگڑے مقدر میں کیا نہ تھا“

شہلا نقوی نے معاشرتی مسائل پر لکھا۔ ان کا شعری سفر ہنوز جاری ہے۔ انھوں نے پدر سری نظام اور مردوں کی حقوق پر اجارہ داری کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ شہلا کی غزلوں میں مصرعوں کی بُنت اور تراش خراش سے زبان پر گرفت اور مضمون پر دسترس کا پتہ چلتا ہے۔ شہلا نے علامت کے ذریعے غزل کی بُنت کے عمل کو اٹھان دی ہے۔ شہلا کے ہاں خواب ہیں جن کی تعبیر کے حصول سے انھیں سفر کرنے سے ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ رات، طوفان، آندھی، سویرا، تاریکی، چاند، بادل، ہوا اور اشبنم ان کی غزل کی مخصوص لفظیات ہیں جس نے یہ خوبصورت شعری پیکر تراشتی ہیں۔

”وقت کی آندھی سے یوں ہر سو بگولے بن گئے / ہو گئی روپوش منزل بھی نقابِ گرد میں“

”شہلا سارے دن کے لمحے صرف زمانے بھر پہ کیے / شام ہوئی تو گھر کو لوٹی پھر کاموں میں ڈوب گئی“

ترنم ریاض نے متعدد جہات پر کام کیا ہے۔ ان کی نثری کاوشات گراں قدر ہیں۔ بطور شاعرہ انھوں نے نظم اور غزل میں طبع آزمائی کی اور قد آور شاعرہ کے طور پر سامنے آئیں۔ ترنم کے ہاں مخصوص لفظیات کا ڈکشن ہے جس سے نزائی مسائل اور معاشرے میں درپیش ہنگامی صورتحال کا ٹھہراؤ اور قدرے سبھاؤ سے استعمال کرتی ہیں مصرعوں میں تازگی اور شعر میں جدت غضب کی ہوتی ہے۔ سمیرا بانو لکھتی ہیں: ”ان کے یہاں خود اعتمادی اور خود شناسی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نظم نگاری میں بھی اپنے جذبات و احساسات اور تجربات کو الفاظ میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔“ (۱۱)

”گھر کے اندر انا کے جھگڑے کیوں دہراتے رہتے ہو / سیدھی رہ اپنا لو، پیلی ہوں، ٹیڑھی ہو جاؤں گی“

”چمن اُجڑا اور خواب آیا مجھ کو / صبار قصاں ہے طائر بولتے جا رہے ہیں جیوتی سک“

نصرت آرا کے ہاتھ زیادہ تر جذباتی اور سطحی قسم کا تاثراتی اظہار ملتا ہے۔ خانگی مسائل کے علاوہ رومانوی دور کی کسک اور نا آسودہ خواہشوں کی تڑپ ان کی شاعری کو گداز بناتی ہے۔ شعر میں برجستگی کا عنصر موضوع کی نزاکت سے آگہی کا پتہ دیتا ہے۔ نصرت نے غزل کے سانچے کو نسائی آہنگ سے تراوت بخشی ہے۔ نصرت ہاں برسات، بادل، ہوا، جنگل، موسم، پرندے اور بادِ صبا ایسی لفظیات سے تشبیہ، استعارے اور علامتیں وضع کرنے کا رجحان ملتا ہے جس سے ان کی غزل کارنگ و آہن فطرت کے قریب تر محسوس ہوتا ہے۔

”جیون کے موسم کو کیسے روپ بدلتے دیکھا / ہنستے ہوئے بادل سے میں نے خون برستے دیکھا“

سیدہ نسرین نقاش نے اردو غزل کے اکیسویں منظر نامے پر اپنی مستقل شناخت بنائی ہے۔ ان کی شاعری میں عورت مرکزی موضوع کی حیثیت سے موجود ہے۔ نسرین نے مرد سماج کو کوسنے کی بجائے عورت کو مضبوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ نسرین نے وفا کے تقاضوں کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک انسانی احترام کا فلسفہ سب سے بڑا مذہب ہے۔ انسان بہ حیثیت انسان دوسرے انسانوں سے اپنا رشتہ استوار کرتا ہے۔ نسرین کے احترامِ آدمیت کی روایت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

”کوئی آئے گا نہ مجھ سا بخدا میرے بعد / ختم ہو جائے گا دستورِ وفا میرے بعد“

ثمینہ راجا نے اردو شاعری کو خواتین شعرا میں وہ مقام عطا کیا ہے جس کی یہ مستحق تھیں۔ ثمینہ نے پروین شاکر اور فہمیدہ ریاض کے اسلوب کا تتبع کیا اور انھیں کی طرح ممنوعہ موضوعات پر جرات سے قلم اٹھایا اور اپنی انفرادیت قائم کی۔ ثمینہ

نے بیسویں صدی کے اواخر کی غزلیہ روایت کو جس طور سے نبھایا ہے وہ انھیں کا خاصہ ہے۔ شمیمہ کی غزل کا رنگ پختہ، چوکھا اور گہرا ہے۔ شمیمہ کے موضوعات عورت مرد کے باہمی رشتے کی لکیر کے گرد گھومتے ہیں جس میں ذرا سی بدگمانی کے در آنے سے طوفان برپا ہو جاتے ہیں۔

”اُس کی بانہوں میں سمٹ جانے کی گھٹ جانے کی خواہش، توبہ / رات جب دیر تلک چاند تہہ آب گرفتار رہا“

”نچوڑ لیں مرے چہری کی سرخیاں، پھر بھی / گریز پا مرے گھر سے بہا کیوں گزرے“

رخسانہ جبین نے غزل کے کینوس کو سماجی آلام سے پوٹریٹ کرنے کی بجائے نسائی استحصال کے بیان کے لیے رنگ کو ترنگ سے شناسا کیا ہے۔ رخسانہ نے تخیل کی مدد سے تجربے کی حقیقت کو شعر کے پردے میں بیان کیا جس سے انسانی توازن کے منحنی فلسفے کا احیا ممکن ہوا۔ رخسانہ نے غزل کو اپنے زمانے کی آواز بنایا ہے۔ رخسانہ کے ہاں غزل کی روایتی سانچے سے انحراف ملتا ہے۔ رخسانہ نے غزل کو تغزل کے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ رخسانہ کے طلسمی فضا کا ایک مصنوعی جہان ملتا ہے جس میں فطرت کی بو قلمونیاں اس قدر مقیش انداز میں مرصع کی گئی ہیں کہ بناوٹ کا عنصر زائل ہو جاتا ہے اور زندگی ہنستی مسکراتی دکھائی دیتی ہے۔

”ایک معمہ ہے وہ، ویسے کتنا بھولا بھالا ہے / ایک اک رنگ انوکھا اس کا ہر انداز نرالا ہے“

جیوتی سکسینہ نے غزل میں آفاقی سچائیوں اور ارضی جل سازیوں اور فتنہ پرداز یوں کو نمایاں کیا۔ جیوتی نے زندگی کو جس طرح محسوس کیا ویسے ہی لکھ ڈالا۔ اشعار عموماً توجہ کو مبذول کرتے ہیں۔ جیوتی نے غزل کو تغزل کے طور پر برتا ہے۔ جیوتی کے ہاں مخصوص علامتوں کا تمثیلی جہان دکھائی دیتا ہے۔ جیوتی نے گھر سے باہر کی دنیا سے آنکھیں پھیر کر اپنے اندر کی دنیا سے رشتہ استوار کر لیا ہے جس میں اس کی اپنی ذات کے اسرار بھی کہیں ذاتِ تخیل میں پنہاں ہو گئے ہیں۔

”شمع مدھم، لو پرشیاں، خامشی افسردگی / بزم میں ان کے چلے جانے کا منظر دیکھنا“

سلطانہ مہر نے شاعری کی اور بہت خوب کر رہی ہے۔ سلطانہ کے ہاں سماج میں ہر طرف جاری اندھیر نگری اور حقوق کی حق تلفی کا مرصع رد عمل ملتا ہے۔ سلطانہ مہر نے عورت کے وجود سے متصل اندیشوں اور امکانات کے خدشوں کو سادہ، آسان اور سہل انداز میں مرد سماج کے پروردہ ٹھیکے داروں تک پہنچایا ہے جس میں ان کی شاعرانہ معنویت کی فکری اٹھان کا ہاتھ ہے۔

”میں اپنے شک چھڑک دوں کہ خاک دب جائے / ابھی نہ آوا بھی تو غبارِ راہ میں ہے“

”جس جس کو تو گوہر سمجھا کنکر سے وہ بدتر تھا / اے دلِ سادہ اب بھی سنبھل جا کب تک دھوکے کھائیں ہم“

مینو بخشی اردو غزل کی معتبر آواز ہے جس نے اردو غزل کے ایوان میں شاعرات کو ایک ممتاز مقام دلایا ہے۔ پروین شاکر کے بعد بھارت میں مینو بخشی کی شاعری حوالہ بنی۔ انھوں نے اپنی نظموں اور غزلوں میں جس طرح عورت کے وجود اور ذات و تشخص سے متصل تصورات و نظریات کو تفہیم عطا کی، یہ خلا صدیوں بعد پُر ہوا ہے۔ سچائی راستی بے باکی اور نڈر لب و لہجے کی اس شاعرہ نے غزل کے فنی حُسن کو مزید چمکایا اور بڑھایا ہے۔ مینو بخشی نے نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن انکی غزل کا رنگ زیادہ پختہ ہے۔ مینو کے ہاں انسانی جذبات کی ہم آہنگی زیادہ شدت سے شعر کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ملتی ہے۔ مینو نے آزاد فضا کو غنیمت جانا ہے اور اس میں بارود کی بدبو کو محسوس کرتے ہوئے اس کے خلاف بغاوت بھی کی ہے۔ مینو کی غزل میں استعارے کا عمل بہت زیادہ ہے۔

”دودن کی زندگی ج و مرے نام ہو گئی / اے عشق وہ بھی مورد الزام ہو گئی“

”اُسے سمجھانے جو بیٹھوں وہ سمجھانے لگے مجھ کو / نتیجہ دل کے سمجھانے کا نکلے بھی تو کیا نکلے“

حمیدہ شاہین کا شمار جدید لب و لہجے کی ماڈرن خواتین شاعرات میں ہوتا ہے۔ حمیدہ نے غزل کو مردوں کے کہنے کی چیز نہیں رہنے دیا بلکہ اپنے بلند شعری احساس سے اسے نسائیت کی زبان بنایا ہے۔ حمیدہ شاہین کے لہجے میں بے باکی اور بے خونی سر چڑھ کر بولتی ہے۔ روایات کی پاسداری اور احترام انسانیت کا یکساں توازن ان کی شاعری کا مرکزی نکتہ ہے۔ ظفر اقبال لکھتے ہیں:

”حمیدہ شاہین جس سہولت سے شعر کہتی ہیں یوں لگتا ہے یہ انداز ان کا ذاتی اور انفرادی ہے۔ ان کا یہ انداز غزل کی موجودہ فضا میں نئی کھڑکی کھلنے کے مترادف ہے۔“ (۱۲)

”کدھر تلاش کروں اعتبار چشم و خرد / طلب کو لے گئے بہلا کے التباس کہاں“

”فرط حیرت سے بدن گنگ ہے، جاں لب بستہ / آپ کو جیت لیا، آپ کی حقدا رہوئی“

حمیرا شاہین عمدہ شاعرہ ہیں۔ ان کے ہاں نسائیت کا پرچار معمولی اور روزمرہ معاملات کے سلگتے تڑپتے احساس سے واہوتا ہے۔ حمیرا نے حوادثِ زمانہ کی کسک سے شعری توازن کو سینچا ہے اس لیے ان کے ہاں نسائی لہجے میں معصوم اور گداز کے کی موجودگی کم ہے اس کے باوجود شعر توجہ کو کھینچتے ہیں۔

”بہت اچھے بہانے آگئے ہیں / ہمیں آنسو چھپانے آگئے ہیں“

”سراپ خوش گمانی سے کہیں آگے کھڑی ہوں / میں خود اپنی کہانی سے کہیں آگے کھڑی ہوں“

عنبرین حبیب عنبر کا شمار عہدِ حاضر کی مقبول ترین شاعرہ میں ہوتا ہے۔ پروین شاکر کے بعد جس شاعرہ کو سب سے زیادہ توجہ اور پیار ملا ہے وہ عنبرین حبیب عنبر ہیں۔ عنبرین نے مشاعرہ کی نظامت کو کمال خوبصورتی سے اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کھٹن اور مشکل مرحلے کو نہایت آسانی اور کامیابی سے نبھا رہی ہیں۔ عنبرین کی غزل کا رنگ تیکھا، شوخ اور سلجھا ہوا ہے۔ ان کی شاعرانہ حسیت منجھے ہوئے مشاقِ چتر کار کی طرح تصور کو مقیش کرتی ہے تو کوئی نقص باقی نہیں رہنے دیتی۔

”تری پسند میں ڈھلتی نہیں مری ذات / میں روزنت نئے سانچے بناتی رہتی ہوں“

”فیصلہ پچھڑنے کا جب کر لیا ہے تم نے / پھر مری تمنا کیا مری اجازت کیوں“

نصرت مہدی کی غزل کا رنگ جدید اور کلاسیک روایت کے ملے جلے رجحان سے تشکیل پایا ہے۔ نصرت نے غزل کو احتجاج کی زبان بنایا۔ انھوں نے نثری نظم میں شہرت حاصل کی۔ آج کل غزل پر زیادہ توجہ صرف کر رہی ہیں۔ ان کے ہاں آمد کی نسبت آورد کی کار فرمائی زیادہ نظر آتی ہے۔

”یہ حوصلہ جو ابھی بال و پر میں رکھا ہے / تمہاری یاد کا جگنو سفر میں رکھا ہے“

”کرتی پھرتی تھی اُجالوں کی قبامری تلاش / اور میں تھی کہ اندھیروں کے کسی غار میں تھی“

صائمہ آفتاب عمدہ شاعرہ ہیں۔ ان کے ہاں انسانی جذبات کا سلجھا انداز ملتا ہے۔ صائمہ کے ہاں ایک ترشا ہوا اسلوب ملتا ہے جو ان کی نظموں کو بہت سوٹ کرتا ہے لیکن غزل کہتے ہوئے ان کا دم گھٹتا ہے۔ ان کے ہاں گہری معنویت کی سطح پر تیں بکھری اور منتشر ملتی ہیں۔ ریاضت سے ہچکچاہٹ کے پیش نظر ان کی شاعری کا رنگ ابھی تک پختہ نہیں ہو سکا۔

”پچھڑنے کی سہولت نہ مل جائے / مکیں کو اذنِ ہجرت نہ مل جائے“

”نبھا ہنا ہے بہر صورت یہ کار و بار دُنیا / کہ عشق و عاشقی کا سلسلہ کافی نہیں ہے“

ناصرہ زبیری کا شمار ایک سوشل ایکٹوسٹ اور صحافی کی حیثیت سے ہے۔ ان کی شاعری کا رنگ بھی قدرے صحافیانہ ہے۔ ناصرہ نے غزل کہی اور خوب کہی۔ ان کی نظم میں معاشرت اور سیاست کا ملا جلار جھان ملتا ہے۔ ناصرہ نے عورت کو دکھوں اور مظالم سے اٹی پوٹلی قرار دینے کی بجائے پدر سری نظام میں سامنے آنے کی دعوت دی ہے۔ ان کے اشعار اپنے اندر معاشرت کو منافقت کا گہرا نوحہ لیے ہوئے ہیں۔ ظفر اقبال لکھتے ہیں: ”ناصرہ زبیری کی غزل کئی خصوصیات کی حامل ہے جن کی بنیاد پر اسے اعلیٰ غزل گو کے طور پر یاد کیا جاسکتا ہے۔ ناصرہ روایتی زبان استعمال کرتے ہوئے ایسے شعر نکالتی ہے کہ سیدھے دل میں جا کر ٹھاہ لگتے ہیں۔ ناصرہ کی شاعری محبت اور سماج کے سنگم سے طلوع ہوتی ہے۔“^(۱۳)

”نہیں ہے یوں کہ اُسے ہم تمام بھول گئے / وہ شکل یاد رہی اس کا نام بھول گئے“

”تمہارے عہد الفت کی خلافت مان لی دل نے / تمہارے بعد یہ بعیت نہیں ہو پائی کوشش کی“

علینہ عطر عہد حاضر کی ممتاز شاعرات میں مقبول نسائی لب و لہجے کی شاعرہ ہیں۔ علینہ نے غزل کو نسائی جذبات سے مامور کیا ہے۔ علینہ کے ہاں اپنے مخصوص الفاظ ہیں جنہیں روایتی اور پیش آمدہ واقعات کے بیان میں استعمال کرنے کا خداداد سلیقہ رکھتی ہیں۔ فطرت سے ہم آہنگی اور سماجی اقدار کی کھلی منافقت میں بہ حیثیت عورت سروائیو کرنے کی جرات علینہ کی غزل کا چہرہ ہے۔

”شدید دھوپ میں سارے درخت سوکھ گئے / بس اک دعا کا شجر تھا جو بے ثمر نہ ہوا“

”کوئی ملا ہی نہیں جس سے حال دل کہتے / ملا تو رہ گئے لفظوں کے انتخاب میں ہم“

راحیلہ اشرف راجپوت بہت کم لکھتی ہیں۔ مشاعروں میں برابر شرکت سے بطور شاعرہ پہچان بنائی۔ کلام میں سنجیدگی اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ غزل عمدہ کہتی ہیں اور آمد کی قائل ہیں۔ مرور وقت کے ساتھ ان کے کلام میں متنوع رنگوں کی آمد کا رجحان دکھائی دیتا ہے۔ راحیلہ کی غزل کا موضوع محبت ہے۔ راحیلہ نے غزل کو محبت کا استعارہ قرار دیا ہے۔ محبت کے بغیر شعر کہا نہیں جاسکتا۔ محبت میں کسی کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔ محبت مل جانے اور کھو جانے سے ماورا ہوتی ہے۔ راحیلہ نے غزل کو سراپا محبت کہا ہے۔

”یہ میرے خواب کا رستہ ہے گزر سکتے ہو / بن کے اک نقش میرے دل میں اتر سکتے ہو“

”ہم اپنے دل سے محبت نکال پھینکیں گے / تمہارے حکم کی تعمیل کر کے چلتے ہوئے“

تسنیم کوثر کم گو شاعرہ ہیں۔ ان کی غزل میں نسائیت موضوعات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اپنے سے ناراض رہنے اور سمجھوتے کی چادر میں قناعت سے زندگی بسر کرنے کا رجحان تسنیم کی غزل کی اساس ہے۔ تسنیم کے ہاں غزل کے امکانات روشن دکھائی دیتے ہیں۔ تسنیم کے غزل کی زبان کو رومانوی بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ہاں محبت سے متصل جذبات سے ہم آہنگ فضا کا طلسمی پرتو دکھائی دیتا ہے۔ تسنیم نے عورت کو اپنے اندر سے باہر جھانکنے کا حوصلہ دیا ہے جو اپنے آپ میں ایک بڑا قدم ہے۔

”درد کے تیر جگر کے پار ہوا کرتے تھے / ہم محبت کے سزاوار ہوا کرتے تھے“

”فیصلے اب بھی سر دراز ہی ہوتے ہیں یہاں / فیصلے تب بھی سر دراز ہوا کرتے تھے“

سیماب ظفر غزل گو شاعرہ ہیں۔ عہدِ حاضر کی نمائندہ شاعرات میں آپ کا نام لیا جانا چاہیے۔ سیماب کی غزل کارنگ پختہ اور پُر اثر ہے۔ سیماب بے روایتی مضامین بھی باندھے لیکن محض روایت پر انحصار نہیں کیا بلکہ عہدِ حاضر کے جملہ ماحول کے ردِ عمل کو بھی غزل کا حصہ بنایا۔ طویل بحر میں غزل کہنا سیماب کا نیا تجربہ ہے جسے سراہا جا رہا ہے۔

”کون دروازہ کھلا رکھتا برائے انتظار / رات گہری ہو چلی رہو عبث ہے کل پکار“

”کوچہ ہائے دل و جاں کی تہرہ شبو آس مرقی نہیں / آخری سانس بھرتے ستارو سنو آس مرقی نہیں“

رخسانہ صبا جدید لب و لہجے اور بلند آہنگ کی حامل شاعرہ ہیں جنہوں نے روایت سے استفادہ کے باوجود اپنے لیے نیا شعری اسلوب وضع کیا۔ رخسانہ کے ہاں عورت محض عورت نہیں بلکہ کائنات کی تمام موجودات کے مظاہر کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ رخسانہ کے ہاں موضوعات کا اختصاصی چناؤ ملتا ہے جس سے شعر تراشنے کی ریاضت کا احساس ہوتا ہے۔

”گرچہ دہلیز پہ لاکر بھی بٹھائی گئی میں / دھول تھی راہ گزر کی، سواڑائی گئی میں“

”کب سے قبلہ رو بیٹھے ہیں حرفِ دعا اور میں / خاموشی کے ساتھ ہیں دونوں میرا خدا اور میں“

تنویر انجم کی غزل عہدِ حاضر کی غزل کا اجتماعی منظر نامہ ہے۔ تنویر انجم نے نظم کہی اور خوب کہی لیکن غزل میں ان کی فکری اٹھان نہایت بلند ہے۔ تنویر کے ہاں معاشرت اور سماج کے سنگم سے پنپنے والے جرائم کی نشاندہی ملتی ہے۔ تنویر نے غزل کو جذباتی کیفیت سے نکال کر مبارزت اور مکالمے کی چیز بنایا ہے۔ تنویر کے اشعار ایک انتخاب معلوم ہوتے ہیں جن پر تخلیقی ورود کا گمان گزرتا ہے۔

”شہروں کے سارے جنگل گنجان ہو گئے ہیں / پھر لوگ میرے اندر سنسان ہو گئے ہیں“

عشرت آفریں کا شمار عہدِ حاضر کی ممتاز ترین خواتین شاعرات میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں گہری سماجی معنویت اور نسائی شعور ملتا ہے۔ عشرت نے زندگی کے نسائی پہلو کو حوادثِ زمانہ کے سلاسل میں رکھ کر دیکھا ہے۔ عشرت کی غزل کارنگ فطری اور اصلی ہے۔ ان کے ہاں اشعار کی تہ در تہ پر تیں آپس میں متصل و مدغم ہیں جن میں عورت کے وجود اور تشخص سے منسوب اندیشوں، واہموں اور الزام تراشیوں کے سائے لپٹے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ قیصر عباس لکھتے ہیں: ”عشرت آفریں کا لہجہ کشورناہید اور فہمیدہ ریاض کی طرح احتجاجی تو نہیں مگر غزل اور نظم دونوں میں انہوں نے دھیمے انداز میں صنفی مزاحمت کرتے ہوئے مرد کے رویوں کو بھرپور انداز میں چیلنج کیا۔“ (۱۴)

”شمعیں اور سائے سے دیکھے گئے طوفان کی رات / اس حویلی میں جو مدت سے بہت ویران تھی“

”صبح وصال کی کرنیں ہم سے پوچھ رہی ہیں / راتیں اپنے ہاتھ میں خنجر کیوں رکھتی ہیں“

ناہید ورک مہجری شاعرہ ہیں۔ ان کے ہاں وطن سے دور ملکِ اغیار میں مقیم عورت کے مسائل اور اس کی ذات سے متصل اندیشوں اور واہموں کا ذکر ملتا ہے۔ ناہید نے غزل کو مترنم بنایا اور موسیقیت کے آہنگ سے مترنم بحر کا انتخاب کیا۔ ان کی نظمیں موضوعات کے اعتبار سے توجہ کھینچتی ہیں۔ ناہید کے ہاں بدلیسی ملک میں مقیم عورت کے مسائل اور وطن سے دوری کا تصور ملتا ہے۔ ناہید نے وطن کو اولاد کے مشابہ قرار دیا ہے۔ عشق کے تصور کو ناہید نے وطن کے تلازمے سے مقیش کر کے دیکھا ہے۔

”مرا ہو کے بھی نہ وہ ہوسکا / یہ عجیب صورت حال ہے“

”نیند میں جاگتا ہی رہتا ہے / دل ترے عشق کی دھال میں گم“

عارفہ شہزاد اردو ادب کی استاد ہیں۔ شاعری کے علاوہ نثر بھی لکھتی ہیں۔ ان کی نظموں کا پھیلاؤ آفاقی ہے اور غزل بھی زمین سے اُٹھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ماوہد جدیدیت کے ابہام و اوہام اور تصورات کی اتھاہ معنویت ان کی مخصوص شعری لفظیات میں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ عارفہ شہزاد کی غزل میں مسافرت اور حیرت کا عنصر گہرا تاثر لیے ہوئے ہے۔ انھوں نے اپنی ذات سے کے اسرار کو واکرنے کی بجائے انھیں طلسمی فضا میں علامتوں کے ذریعے مجہول کر کے دیکھنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کی غزل کا رنگ علامتی سے زیادہ استعاراتی ہو گیا ہے۔

”تجھے آغاز ہی سے پڑھ لیا تھا / ترے چہرے پہ سب لکھا ہوا تھا“

”خواب میں جاگتی بے خوابی پتہ پوچھتی ہے / کیا کہیں نیند بھی ہوتی ہے سلانے والی“

فرح رضوی کا شعری سفر تیس سال کو محیط ہے۔ فرح کے ہاں نسائی شعور کا گہرا ادراک ملتا ہے۔ فرح نے غزل کے سانچے کو نسائی حسیت سے معمور کیا ہے۔ فرح کے ہاں سادہ اور عام فہم انداز ملتا ہے جو ان کی شاعرانہ اچ کا عکاس ہے۔ فرح رضوی کے ہاں نسائی فکر و فلسفہ کا آہنگ زیادہ واضح ملتا ہے۔ فرض نے جدید زمانے کے تقاضوں کو نسائی بیانیے سے مشروط کر کے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ فرح کے ہاں محبت بھی ایک چیز ہے مگر عورت اس سے بہت آگے کی چیز ہے۔

”حسرت کے داغ دست طلب سے نہیں ڈھلے / بھاری تھے خواب آنکھ سے پورے نہیں ڈھلے“

”ہمارے زخم تماشا نہیں ہیں غیرت ہیں / سو اس لیے بھی چھپاتے ہیں اک زمانے سے“

شازیہ اکبر کی نظمیں بہت دائرل ہو رہی ہیں البتہ غزل بھی ان کے ہاں سلجھی اور متانت لیے ہوئے ڈگ بھرتی دکھائی دیتی ہے۔ شازیہ نے عہدِ حاضر کے مسائل کو عورت کی آنکھ سے دیکھا اور حیرت بھری آنکھ کو محو تماشا بنا دیا۔ شازیہ کے ہاں

احتجاج کے ساتھ حق کے حصول کا رد عمل بھی دکھائی دیتا ہے۔ شازیہ نے نظم کو غزل کے تناظر میں برتا ہے لیکن غزل اور چیز ہے اور نظم اور چیز ہے۔ شازیہ کے ہاں غزل کی زمین زیادہ تر داخلی واردات کے بیان کا ایک موزوں بیانیہ معلوم ہوتی ہے۔ محمد اکبر خان اکبر لکھتے ہیں: ”شازیہ اکبر کے فنی سفر کا جب بھی جائزہ لیا جائے گا تو ان کی غزل گوئی کو اولیت حاصل ہوگی۔ ان کی غزل غنائیت اور روائی سے عبارت ہے جس میں جابجا ان کی لاجواب سخن سرائی کے بے شمار رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ شازیہ اکبر کی غزل میں روائی، غنائیت اور ندرت خیال بھی پورے درشن کرواتی معلوم ہوتی ہے۔“ (۱۵)

”دیپ جلے تو دیپ بجھانے آتے ہیں / شہر کے سارے لوگ رلانے آتے ہیں“

”کوئی اپنے لیے شاید زیادہ جی نہیں سکتا / کسی کا آخری پیغام ہے یہ رابطہ کر لو“

فریحہ نقوی نوجوان شاعرات میں ابھرتی ہوئی شاعرہ ہیں جن کے غزلیہ موضوعات انوکھے، منفرد اور دلآویز ہیں۔ فریحہ نے مشاعروں میں شرکت سے شہرت حاصل کی۔ ان کے ہاں آمد کی نسبت آورد اور ستائش کی نسبت ریاضت کا گمان گزرتا ہے۔ فریحہ کی غزل کا تیور آنے والے وقت کی غزل کا نمائندہ دکھائی دیتا ہے۔

”ہم تحفے میں گھڑیاں تو دے دیتے ہیں / اک دو بجے کو وقت نہیں دے پاتے ہیں“

”زمانے اب ترے مد مقابل / کوئی کمزور سی عورت نہیں ہے“

شامہ افق کا شمار جدید لہجے کی شاعرات میں ہوتا ہے۔ شامہ نے حوادثِ زمانہ اور گھریلو نزاعات کو غزل کی زبان دی۔ شامہ کے ہاں لفظیات کے انتخاب سے شعر کا سانچہ تیار کرنے کی ریاضت دکھائی دیتی ہے۔ شامہ نے خود کو غزل میں تلاش کرنے کی جستجو کر رکھی ہے۔ شامہ نے غزل کو شاعری کا پیرہن قرار دیا ہے۔ شامہ کے وحشت، دہشت، خوف، اندیشے، ڈر اور واسے کا تصور ملتا ہے۔ شامہ نے غزل میں میز نیازی کے اسلوبِ شعری کو جدت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک نیا اضافہ ہے۔

”دہشت کے موسم میں کھلنے والے پھول / پتی پتی بکھرے کون سنبھالے پھول“

”میں رنگ برنگی مورنی مرے پنکھ بہت ممتاز / مرار قص انوکھا قص ہے مجھے اپنے آپ پہ ناز“

رابعہ بصری بلتستان سے ہیں۔ ان کی غزل میں شمالی علاقہ جات کی عکاسی ملتی ہے۔ عورت کو پہاڑوں کی طرح سخت جان اور چار دیواری میں محصور رابعہ کے ہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ رابعہ نے غزل میں فطرت کے متنوع رنگوں کو نسائی آہنگ میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ رابعہ کے ہاں بلتی تہذیب اور سماج کی منظر کشی ملتی ہے۔ پہاڑوں، جنگلوں، وادیوں جھرنوں اور

آبشاروں میں محبت کے گیت کا انوکھ اندازِ رابعہ کے ہاں کہیں اُداسی لیے آتا ہے اور کہیں نشاط کے جُنک جھونکوں میں لپٹے وصل کے لمحوں کی یاد دلاتا ہے۔

”سیاہ شال پہ جواشک کاڑھتا ہو گا / کسے خبر تھی اُسے مجھ سے مسئلہ ہو گا“

”غم ترا آنکھ کے پانی سے نکل آیا تھا / درد پھر اپنی فشانے سے نکل آیا تھا“

صائمہ اسحاق کا تعلق جنوبی سندھ سے ہے۔ ان کی غزل اور نظم کا پھیلاؤ زمان و مکان کی تحدید سے ٹکڑا تاد کھائی دیتا ہے۔ ایک طرح کی بے چینی اور اضطراب ہے جو صائمہ کے ہاں صداقت اور جواز بن کر غزل کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ صائمہ کا شعری تموج صنفِ غزل کے ارتقا کا معتبر حوالہ ہے۔ صائمہ نے مرکز سے دور وسائل کا نوحہ لکھا ہے۔ اس کے زمین بھر ہے اور پانی دیکھنے کو نہیں ہے۔ صائمہ کا سماجی شعور بہت پختہ ہے۔ صائمہ کی غزل میں جن مسائل کا ذکر ملتا ہے وہ انسان سے زیادہ انسانوں کی ضرورت سے زیادہ متصل دکھائی دیتے ہیں۔ صائمہ نے غزل کو اپنے زمانے کا احتجاج نامہ قرار دیا ہے۔ صائمہ کو اپنے ارد گرد کے بے لوگوں کے منفی رویوں اور شر مسار حرکتوں پہ غصہ آتا ہے اور ان کی میلی سوچ سے گھن ہوتی ہے۔

”زمین میلی ہے نہ آسمان میلا ہے / دلوں کے کھوٹ سے سارا جہان میلا ہے“

”لوگ حیران ہیں کیوں دیکھ کے تم کو آخر / اس تجسس میں تمہیں دیکھنے آئے ہم بھی“

انعمنا علی غزل گو شاعرہ ہیں۔ ان کی شاعرانہ اُٹھان روایت سے استفادے کا پتہ دیتی ہے۔ انعمنا نے غزل کو اظہار کا وسیلہ بنانے کی بجائے عورت کے وجود کی بقا قرار دیا ہے۔ انعمنا کے ہاں شعری تلازمے اور علامات کا مخصوص انداز ملتا ہے جس سے ان کی شعری حیثیت کے دوواہوتے ہیں۔ انعمنا نے غزل میں جدید علامتوں اور محاکات کو متعارف کروانے کی کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے انعمنا کا شعری سفر کامیاب دکھائی دیتا ہے۔ انعمنا کے موضوعات روایتی اور کلاسیکی ہیں البتہ کہیں کہیں جدت اور ندرت کا عنصر بھی دکھائی دیتا ہے۔

”رونے کا سلیقہ مجھے اسلاف نے بخشا / یہ ماتی آنکھیں مجھے ورثے میں ملی ہیں“

”میں بلندی سے گرائی گئی جس محنت سے / اس میں اپنوں کے بھی کردار نظر آتے ہیں“

مقدس ملک کا شعری سفر دو دہائیوں پر مشتمل ہے۔ ان کی غزل میں روایت کا تتبع ہے اور جدید رجحان کی طرف مراجعت بھی۔ مقدس نے سہل اور آسان بحر میں سہل ممتنع کے انداز کو اختیار کیا۔ عام فہم اور روزمرہ لفظیات سے شعری گلستان مقیش کرتی ہیں۔ عمدہ شعر کہہ رہی ہیں۔ مقدس کے ہاں مشرقی روایت سے متصل عورت کی جملہ زبیت کا احوال کُل

کر چیاں کر چیاں ہو کر شعروں میں ڈھلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مقدس نے سوالوں کے جوابوں سے انحراف کیا ہے اور خود سوال بن کر جواب کے روبرو آ کر سوال اٹھانے والوں کو حیران کر دیا ہے۔

”اس نے نظریں ہی پھیر لی مجھ سے / کچھ نہیں رہ گیا سوالوں میں“

”میں سوچتی ہوں کہ پھر جرم کس کے سر جائے / سبھی ثبوت اسے بے نگاہ کرتے ہیں“

سبیلہ انعام صدیقی غزل کے علاوہ نظم اور رباعیاں کہتی ہیں۔ عمدہ شاعرہ ہیں۔ شعری سفر جاری ہے اور عمدہ کلام کہہ رہی ہیں۔ نسائی روایت کی امین اور جدید لب و لہجے کی دلدادہ اس شاعرہ کی لفظیات پڑھنے والے کو اپنے اثر میں لے لیتی ہیں۔ سبیلہ کے ہاں اکیسویں صدی کی لڑکی کے جملہ جذبات بحر بیکراں میں اوندھے بستے دکھائی دیتے ہیں۔ سبیلہ نے خود کو نرگسی اور ماڈرن لڑکی کے روپ میں غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ سبیلہ کے ہاں وفاداری اور ایفا کے تقاضے محض مکرو فریب کے جال ہیں۔

”وہ میرے ہاتھ سے برسات کے زمانے میں / پکوڑے کھائے گا اور چایے بھی پیے گا ہی“

”وفا کے راز سے پردہ نہیں اٹھاؤں گی / میں دل کے زخم تہ دل سے ہی چھپاؤں گی“

جاناں ملک کی غزل کا رنگ منفرد اور روایت سے ہٹا ہوا ہے۔ سوشل میڈیا کے لوازمات کا رد عمل ان کی غزل میں دکھائی دیتا ہے۔ کہنہ اور غیر مستعمل الفاظ استعمال کرتی ہیں۔ علامات و اوہام اور تمثیل سے دلچسپی ہے۔ ہندی ادب سے گہری وابستگی علامات کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ عمدہ شعر کہہ رہی ہیں۔ جاناں ملک چھوٹی بحر میں چھوٹے مصرعے تراشتی ہیں۔ ان کی غزل میں پیار کی لوری ایسا انداز ملتا ہے۔ جاناں کے ہاں سطحی اور روایتی موضوعات میں غضب کی جدت اور تازگی موجود ہے۔ جاناں نے غزل کو نسائی جذبات کی کومل اور نرم احساس سے متعارف کروایا ہے جس سے شعر میں نسائی رنگ کی تازگی کا احساس دوبالا ہو جاتا ہے۔

”پاس رہا تو قربت کا احساس نہ تھا / اس نے جانے کی ٹھانی تو کانپ گئی“

”بس ایک دھوکا رہ جاتا ہے / بندہ تنہا رہ جاتا ہے“

نیل احمد کا شمار اکیسویں صدی کے اوئل کی ممتاز شاعرات میں ہوتا ہے۔ نیل احمد کے ہاں غزل کا نظمیں انداز ملتا ہے۔ بات کو کھول کر بیان کرنے کی بجائے کہانی کے توسل سے سامنے لانا نیل احمد کا فنی اختصاص ہے۔ نسائی جذبے کی سُرمالا کو فنی جاز بیت سے معمور نیل احمد نے کیا ہے۔ نیل احمد نے ہاں دل اور دل محلے کی سبھی وارداتیں شعر کا مزاج بنتے دکھائی دیتی ہیں۔

نیل نے آنکھوں سے کٹوروں سے کام لیا ہے جس میں محبت کا جام چھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ نیل عمدہ غزل کہہ رہی ہے۔ ان کی غزل میں روایت اور جدت کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے جو آنے والے وقت میں مزید نکھر کر پختہ ہو جائے گی۔

”دل کی اداسیوں کا کوئی سبب نہیں ہے / بس یہ سبب ہے میرے کی اداسیوں کا“

”سارے جذبے تری چاہت کے دکھائی دیتے / کاش آنکھوں میں کہیں دل بھی دھڑکتا ہوتا“

بلقیس خان کا شعری سفر بیس برس کو محیط ہے۔ نوجوان شاعرہ ہیں۔ جذبات بھی جوان اور اظہار بھی بلا کی تابناکی لیے ہوئے ہے۔ محبت کے دریا کو پار کرنے کے بعد دھوکے کے سیراب سے لبریز اس شاعرہ کی غزل میں فنی پختگی کے سبھی لوازمات شعری دکھائی دیتے ہیں۔ بلقیس نے غزل کو تغزل کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ بلقیس کا مطالعہ وسیع ہے۔ ان کی غزل میں موضوع کا انتخاب شائستگی اور سلیقے سے اپنی جگہ بناتا ہے۔ جزئیات سے کام لینا بلقیس کی زبان پر گرفت کا پتہ دیتا ہے۔ بہ حیثیت عورت ہونا بلقیس کو گراں نہیں گزرتا بلکہ اس تشخص کے ساتھ زندہ رہنا ان کے نزدیک زندگی کرنے کا سب سے بڑا معممہ ہے۔

”سمجھ رہی ہوں تو رستہ بدلنا چاہتا ہے / میں تیرے لہجے کی ساری جہات دیکھتی ہوں“

”میرے پیروں کو ڈسنے والا سانپ / میری گردن میں کیوں حائل ہے“

ایمان قیصرانی عمدہ غزل کہہ رہی ہیں۔ ان کے یہاں عصری مسائل کا شعور اور سماجی انحطاط کا نوحہ فراواں ملتا ہے۔ ایمان قیصرانی نے غزل کو مرد کی طرح سنبھالا اور نبھایا ہے۔ موضوعات کے انتخاب اور بیان کے سلیقے سے شاعرہ کے وسعت مشاہدہ اور برق رفتار تخیل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ایمان کے ہاں تہذیب کے منزل اور سماج کے ادخال کی صورت حال کا سراپا انگیز رجحان ملتا ہے۔ ایمان نے دل، دنیا، وجد، شوق، نگاہ، قیاس، الم، خواب ایسے استعارے غزل میں برتے ہیں جس سے ان کی غزل کی زبام لسانی تشکیل کے عمل سے مصفا ہو کر مقیش کے سراپے میں ڈھلی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

”دل تو پہلے ہی جدا تھے یہاں بستی والو / کیا قیامت ہے کہ اب ہاتھ ملانے سے گئے“

”ہنسنے رونے سے گئے ربط بڑھانے سے گئے / ایسی افتاد پڑی سارے زمانے سے گئے“

عاصمہ طاہر کا شمار نوجوان شاعرات میں ہوتا ہے۔ نسائی لہجے کو ڈھال بنا کر مشاعروں میں توجہ حاصل کی۔ ان کے ہاں عورت کوئی مذاق نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت ہے اور وجود رکھتی ہے اور اسے حق ہے کہ وہ اپنی پسند و ناپسند کا دھڑلے سے اظہار کرے اور رد عمل بھی ظاہر کرے۔ عاصمہ نے غزل کے سبھاؤ کو نرمی کی بجائے کھردرا کیا ہے جو عہدِ حاضر کی ناگزیر ضرورت ہے۔

”مرے وجود کے اندر ہے اک قدیم مکان / جہاں سے میں یہ اداسی ادھار لیتی ہوں“

”شام کھلتی ہے تیرے آنے سے / لب پہ تیرا سوال رکھتی ہے“

ثمینہ گل استاد ہیں۔ شاعرہ ہیں۔ خوبصورت شعر کہتی ہیں۔ کم گو ہیں لیکن شعر کا آہنگ بلند بانگ ہے۔ ثمینہ نے غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی لیکن غزل میں ان کا دل زیادہ اسیر ہے۔ محبت ان کا مرکزی موضوع ہے۔ ہلکے پھلکے انداز میں طنز کے تیز دھار تیر شعر کو نشتر بنادیتے ہیں۔ ثمینہ کے ہاں غزل کی جملہ واردات شعری کا بیان ملتا ہے۔ ثمینہ گل نے اکیسویں صدی کی عورت کو اپنے مخصوص شعری بیانیے سے خبردار کیا ہے کہ اب جاگنے اور اپنا حق چھین لینے کا وقت ہے۔ زمانہ بدل چکا۔ اب تمہیں بھی بدل جا چاہیے۔ ثمینہ محبت پر یقین رکھتی ہیں لیکن محبت کو بھیک کی صورت قبولنے سے انکاری ہیں۔ ان کی غزل میں محبت کے ساتھ وفاداری کے تقاضوں کی استواری مشروط دکھائی دیتی ہے۔ ثمینہ نے جدید اردو غزل کی لسانی تشکیل میں نسائی بیانیے سے ہمہ گیر کام لیا ہے۔

”محبت کے سبھی جذبے تمہارے نام کرتی ہوں / وفا کے دل نشیں قصے تمہارے نام کرتی ہوں“

”بڑے ہی تیز چھتے ہیں یہ لہجے مارے دیتے ہیں / مجھے اکثر یہ اپنوں کے رویے مار دیتے ہیں“

صنف غزل میں نووارد شاعرات میں پاک و ہند اور دنیا بھر میں پھیلی خواتین شاعرات میں سیکڑوں نام آتے ہیں جن کے ہاں غزل کے وسیع امکانات دکھائے دیتے ہیں۔ ان شاعرات نے غزل کی صنف کو کمال دلچسپی سے اپنے اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور قوی امید ہے کہ آنے والے دو تین عشروں میں ان نووارد شاعرات میں جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا کے مصداق نمایندہ شاعرات کہلانے کی مستحق ہوں گی۔ ان شاعرات میں ”ماریہ نقوی، نادیا گیلانی، ایمان شہزادی، سدرہ افضل، صباحت عروج، عنبرین صلاح الدین، سدرہ سحر عمران، طاہرہ غزل، جہاں آرا تبسم، نوشین قمیرانی، صنوبر الطاف، تمثیل حفصہ، سارہ خان، فاطمہ مہرو، تجدید قیصر، سندھو ستار پیرزادہ، انعم جاوید، ثانیہ خان، انجیل صحیفہ“ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے۔

”اُس سے بلا کی چاہ تھی دل کے قریب تھا / پر چھوڑنا پڑا وہ بہت ہی عجیب تھا“ (ماریہ نقوی)

”اے دوست اب سہاروں کی عادت نہیں رہی / تیری تو کیا کسی کی ضرورت نہیں رہی“ (نادیا گیلانی)

”تمہاری ذات پہ پہلا سوال کرتے ہوئے / خوشی ہوئی مجھے اپنا ملال کرتے ہوئے“ (سدرہ افضل)

”گئی صدی میں حساب رکھانہ رہزنوں کا / نئی صدی میں سراغ کیسے ملے سروں کا“ (طاہرہ غزل)

”بانجھ پن میں مذافقہ ہے کیا / عشق بچہ ہے پالتے رہنا“ (نوشین قیصرانی) ۷
 ”بام سے ڈھل چکا ہے آدھادن / کس سے ملنے چلا ہے آدھادن“ (صنوبر الطاف) ۷
 ”مجھ کو تو خیر خانہ بدوشی ہی راس تھی / تیرے لیے مکان بنانا پڑا مجھے“ (تمثیل حفصہ) ۷
 ”خواب ٹوٹے تو مری پلکوں پہ آئے سائے / کس طرح آج مری آنکھوں میں چھائے سائے“ (سارہ خاں) ۷
 ”ترے حواس پہ طاری تھا اب مچھڑ جانا / میں ہوش میں تھی مگر نیم خواب ہونا پڑا“ (تجدید قیصر) ۷
 ”فضا میں رنگ سے بکھرے ہیں چاندنی ہوئی ہے / کسی ستارے کی تتلی سے دوستی ہوئی ہے“ (انجیل صحیفہ) ۷

جدید اردو غزل کی تشکیل نو میں مذکورہ شاعرات کا کردار اور حصہ گراں قدر ہے۔ مذکور شعرا نے جس انداز میں جدید اردو غزل کے لب و لہجے اور تراوت کو سنبھالا دیا ہے۔ یہ عنصر اس بات کا غماز ہے کہ اردو غزل کا مستقبل انتہائی درخشاں اور تاباں ہے۔ یہاں یہ امر واضح کرنا ضروری ہے کہ جدید اردو غزل میں طبع آزمائی کرنے والی شاعرات کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ اس مقالہ میں جدید اردو غزل کی تشکیل نو میں شاعرات کے تعارف و انتخاب اور ان کے کلام کی چیدہ چیدہ شاعرانہ معنویت کے ناقدانہ تجزیے کا احاطہ کیا ہے جس سے یہ رجحان سامنے لانے میں مدد ملی ہے کہ جدید اردو غزل میں لسانی تشکیلات کا سفر جاری ہے۔ مرور وقت کے ساتھ اردو غزل دیگر اصناف کی نسبت مزید توانا اور محکم ہوگی۔ اس لحاظ سے یہ مقالہ اردو غزل کے باب میں ایک خوش آئند اضافہ ہے۔

حوالہ جات

1. خالد علوی، ”پروین شاکر کی: خوشبو،“ مشمولہ، قمر رئیس، پروفیسر، مرتبہ، معاصر اردو غزل، دہلی: اردو اکادمی، 1994، ص 144
2. ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر، اردو غزل کا تکنیکی، ہیتی اور عروضی مطالعہ، لاہور: مجلس ترقی ادب لاہور، 2008، ص 309
3. فاطمہ حسن، ڈاکٹر، خاموشی کی آواز، کراچی: انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، 2019، ص 94
4. صالحہ صدیقی، اکیسویں صدی کی اردو غزل میں تانیثی تصور، مشمولہ، (غزل نمبر)، مرتبہ، منصور خوشتر، در بھنگلہ: ستمبر 2017، ص 172
5. نصر غزالی، ڈاکٹر، مشمولہ، ”شہناز نبی کا شعری سفر: مغربی بنگال کا شعری و نثری ادب، مرتبہ، شاید اساز، دہلی: اثبات و نفی پبلی کیشنز، 2005، ص 105

6. خالد علوی، ”پاکستان کی غزل کے نئے رجحانات“، مشمولہ، اُردو غزل عہد بہ عہد، مرتبہ، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، لاہور: دارالشعور، 2015، ص 201
7. عتیق اللہ، پروین شیر: عہدِ ناتمام کی شاعرہ، حیدر آباد: مکتبہ شعر و حکمت، 2011، ص 90
8. آسمہ صدیقی، زاہدہ زیدی کی شاعر: ایک تجزیاتی مطالعہ، مشمولہ، سہ ماہی، اُردو ریسرچ جرنل، مدیر، ابن کنول، شمارہ، جون تا اگست، 2019۔ <https://www.urdulinks.com/urj/?p=3239>
9. وصیہ عرفانہ، ڈاکٹر، بارہ قبائوں کی سہیلی: عذر پروین، مشمولہ، ادبی میراث، -barah، <https://adbimiras.com/qabaon-ki-saheli-azra-parveen-by-dr-wasia-irfana>
10. صائمہ ثمرین، جدید نظم اور ساجدہ زیدی، مشمولہ، ماہنامہ، ترجیحات، مدیر، ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین، مارچ، 2023، <https://shorturl.at/kuAJ9>
11. سمیرا بانو، اکیسویں صدی کی جموں و کشمیر کی چند نمائندہ شاعرات (نسائی حیثیت کے تناظر میں)، مشمولہ، سہ ماہی، اُردو ریسرچ جرنل، مدیر، ابن کنول، شمارہ، جولائی تا ستمبر، 2018، <https://www.urdulinks.com/urj/?p=2567>
12. ظفر اقبال، غزل میں کھلنے والی ایک نئی کھڑکی، مشمولہ، روزنامہ، دُنیا، 24، اگست، 2015
<https://dunya.com.pk/index.php/author/zafar-iqbal/2015-08-24/12399/50349292>
13. ظفر اقبال، تیسرا قدم، ناصرہ زبیری کی شاعری، مشمولہ، روزنامہ، دُنیا، 04 فروری، 2017
<https://dunya.com.pk/index.php/author/zafar-iqbal/2017-02-04/18450/83418010>
14. قیصر عباس، تین نسلوں کا سانجھا دکھ: عشرت آفریں کے شعری مجموعے کے آئینے میں، مشمولہ، جدوجہد، 08، مارچ، 2023، <https://jeddojehad.com/archives/39534>
15. محمد اکبر خان اکبر، چاک پہ رہنے دو مجھ کو، تبصرہ، مشمولہ، کتاب نامہ، 15 فروری 2021
<https://kitaabnama.org/5183>